فرار الی اللہ اور تبتل اختیار کرنے کا حقیقی مفہوم

(خطبہ جمعہ فرمودہ ۱۳ / جنوری ۱۹۸۹ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور انور نے فرمایا:

گزشتہ خطبہ سے پہلے دو خطبوں میں یا تین خطبوں میں میں فرار اِلی اللہ کا مضمون بیان کر رہا تھا۔ یعنی قرآن کریم نے جو یہ ہدایت فرمائی ہے کہ فَفِرُّوْٓا اِلَی اللّٰہِ (الذٰریٰت:۵۱) اللہ کی طرف دوڑو تو یہ فرار الی اللہ یعنی خدا کی طرف دوڑنا کیا معنی رکھتا ہے۔ اِس ضمن میں مَیں نے یہ بات خوب کھول کر بیان کی کہ اللہ کی طرف بھاگنے سے مراد یہ ہے کہ بعض بُری صفات کو چھوڑ کر بعض اچھی صفات اختیار کرنا، غیر اللہ کے رنگ چھوڑ کر اللہ کے رنگ اختیار کرنا اور اس کے سوا خدا کی طرف دوڑنے کے اور کوئی معنی نہیں۔ خدا تعالیٰ کو پکارنا اور بات ہے اور خدا کی طرف دوڑنا اور بات ہے۔ ایک انسان مصائب میں جکڑا ہوا خدا کو پکار تو سکتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ وہ خدا کی طرف دوڑ رہا ہو۔ بعض دفعہ انسان ایسے دشمن کے گھیرے میں آ جاتا ہے کہ وہ نجات دہندہ کا تصور کر کے اس کو بلاتا تو ہے لیکن اس کی طرف جانے کی استطاعت نہیں رکھتا تو مضطر کی دعا کا مضمون اور ہے اور فَفِرُّوْٓا اِلَی اللّٰہِ کا مضمون اور ہے۔ فَفِرُّوْٓا اِلَی اللّٰہِ کا مضمون امن کی حالت سے تعلق رکھتا ہے جبکہ ابھی دشمن نے انسان کو گھیرے میں نہیں لیا اور ہر طرف سے اسے خوف محسوس ہوتا ہے اور جوں جوں خوف کا شعور بڑھتا چلا جاتا ہے، جوں جوں گناہوں کی ماہیت کا زیادہ علم ہوتا چلا جاتا ہے انسان ہر خوف کے مقام سے امن کے مقام کی طرف یعنی خدا کی طرف دوڑنے لگتا ہے۔ تو بدیوں کو ترک کرنا اور نیکیوں کی طرف جانا محض ایک ظاہری دنیاوی کوشش کے طور پر نہیں بلکہ ایک

خاص جذبے کے تابع جس کا ایک گہرا خدا سے تعلق ہے یہ ہے فرار الی اللہ۔ اس ضمن میں مَیں نے ایک مثال پیش کی تھی کہ کس طرح حرص کو قناعت میں تبدیل کرنا فرار الی اللہ ہوتا ہے۔ اس ضمن میں بعض اور صفات کا بھی ذکر آیا۔ اس میں سے ایک غناء اسی طرح تبتل کا ذکر بھی آیا یعنی اپنے آپ کو دوسری چیزوں سے منقطع کر کے اللہ کی طرف تبتل اختیار کرنا۔ اب میں اِس مضمون کے اس حصے پر نسبتاً زیادہ روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا۔

قناعت کا مضمون بہت عمدہ ہے لیکن قناعت کی ترقی یافتہ صورت غناء ہے۔ قناعت اپنی ذات میں کافی نہیں اور قناعت اور غناء میں فرق دکھانے کے لئے میں یہ مثال آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ ایک انسان کے پاس جو کچھ ہے اگر وہ اس پر راضی ہے اور باہر کی طرف جو کچھ اس کے پاس نہیں ہے ان سمتوں میں اتنے حرص کے ساتھ نہیں دیکھتا کہ گویا ان چیزوں کے بغیر اس کی زندگی اجیرن ہو جائے گی تو یہ قناعت ہے لیکن بعض دفعہ ایک قانع آدمی ان چیزوں سے محروم ہو جاتا ہے جو اس کے پاس تھیں اور اس وقت اس کے صبر کا بھی امتحان ہوتا ہے اور اس کے قناعت کا مقام بھی پہچانا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں دو طرح کی صفات انسان کی مدد کرتی ہیں یا تو وہ صابر ہو۔ قناعت کے باوجود ہاتھ میں آئی ہوئی چیز وہ چیز جس کی عادت پڑ چکی ہو اس کے ہاتھ سے نکلنے کے صدمے کو برداشت کرنے کی طاقت صبر سے حاصل ہو سکتی ہے اور اس سے اعلیٰ مرتبہ کی چیز جو قناعت کی ترقی یافتہ صورت ہے وہ غناء ہے یعنی چیزوں سے تعلق تو ہے لیکن ان کے بغیر بے قراری اتنی نہیں بڑھتی کہ گویا انسان کی زندگی اجیرن ہو جائے۔ پس غناء کا مطلب یہ نہیں کہ چیزوں سے تعلق نہیں ہوتا۔ غناء کا مطلب یہ ہے کہ چیزوں سے تعلق ہے تو سہی لیکن ان کے بغیر انسان کا نقصان نہیں ہوتا۔

حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مرزا مبارک احمد سے بہت پیار تھا۔ آپ کے بچوں میں سب سے چھوٹے تھے یعنی لڑکوں میں سب سے چھوٹے تھے اور بہت ہی آپ کو پیارے تھے چنانچہ ان کی وفات پر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو اشعار کہے ان سے پتہ چلتا ہے کہ کتنی گہری محبت تھی ان سے

؎ جگر کا ٹکڑا مبارک احمد جو پاک شکل اور پاک خو تھا
وہ آج ہم سے جدا ہوا ہے ہمارے دل کو حزیں بنا کر

جگر کا ٹکڑا کہا اس کو، پاک شکل، پاک خو۔ ویسے بھی روایتوں سے پتا چلتا ہے کہ بہت پیارا تھا لیکن جب خدا نے بُلا لیا دِل کی آخری آواز یہ تھی کہ

بُلانے والا ہے سب سے پیارا اسی پہ اے دِل تو جاں فدا کر

(درثمین صفحہ: ۱۰۰)

پس وہ غناء جو اللہ کے تعلق کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ چیزوں سے پیار نہیں رہتا۔ اس کا مطلب ہے کہ چیزوں سے پیار تو رہتا ہے لیکن ان کی جدائی محسوس نہیں ہوتی یعنی اس حد تک محسوس نہیں ہوتی جیسے ایسے انسان کو جو ان چیزوں پر انحصار کرنے لگ جاتا ہے۔ پس اس مضمون کو مزید کھولنے کی خاطر میں یہ مثال دیتا ہوں کہ آپ لوگ جو جمعہ میں بیٹھتے ہیں بعض دفعہ گرمیوں میں ایسی دوپہر کے وقت جمعہ ہو رہا ہوتا ہے کہ نیند کا غلبہ ہوتا ہے بعض لوگ کھانا کھا کر آتے ہیں تو کافی نیند کی مستی چڑھ جاتی ہے اور جمعہ میں لوگ اکثر جُڑ کے بیٹھتے ہیں اکثر۔ اگر کوئی انسان جاگا ہوا ہے تو اس کے ساتھ جڑا ہوا انسان اپنے کندھے کو ایک طرف ہٹا لے تو اس جاگے ہوئے انسان کو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ شاید وہ کچھ تھوڑی سی کشادگی محسوس کرے لیکن نقصان کوئی نہیں لیکن اگر اس وقت وہ سو چکا ہے اور اچانک وہ کندھا ہٹائے تو ایسا شخص گر جاتا ہے اور بسا اوقات ہم نے دیکھا ہے کہ بچے بعض دفعہ شرارت سے ساتھ کے بچے کو جو سو چکا ہو گرانے کی خاطر ایک دم اپنا کندھا پیچھے کر لیتے ہیں۔ تو غناء آپ کو گرنے سے بچاتی ہے، آپ کو وہ زندگی کا شعور بخشتی ہے جو آپ میں اور ایک سوئے ہوئے غفلت کی حالت میں زندہ رہنے والے انسان میں فرق کر دیتی ہے۔ آپ سے دنیا کی چیزیں جتنی بھی ہوں وہ اپنا تعلق توڑتی ہیں تو آپ کو بے سہارا نہیں چھوڑ دیتیں کیونکہ آپ کا سہارا خدا کی ذات پر ہوتا ہے۔ یہ ہے غناء جو دراصل قناعت کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ جو شخص قانع نہیں ہے اس کو غناء کا کچھ علم نہیں۔ پہلے قانع ہونا ضروری ہے پھر قناعت میں معرفت حاصل ہونے کے نتیجے میں سچی غناء حاصل ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے متعلق غناء کا لفظ استعمال فرمایا ہے اور اس مضمون کو جب ہم خدا کی ذات میں جاری ہوتا ہوا دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ حقیقی غنی ہے اس کے سوا دراصل کوئی غنی نہیں۔ اسی وجہ سے میں نے غناء کے لفظ کے ساتھ بار بار یہ کہا کہ خدا کے تعلق کی بنا پر غناء

نصیب ہوسکتی ہے ورنہ نہیں نصیب ہوسکتی کیونکہ غناء کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کچھ بھی نہ ہو اور انسان راضی ہو۔ جیسا کہ میں نے کہا تھا قناعت کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ قناعت کے بعد غناء تب نصیب ہوتی ہے جب اس سے تعلق ہو جس کے پاس سب کچھ ہے اس لئے یہ صبر سے بھی مستغنی کر دیتی ہے صبر سے بالا مقام ہے غناء کا۔ اگر یہ انسان کو معلوم ہو کہ جس سے میرا تعلق ہے اس کے پاس سب کچھ ہے اور یہ یقین ہو کہ جو کچھ میرے ہاتھ سے جا رہا ہے وہ اس کے پاس جا رہا ہے تو اس کامل شعور اور عارفانہ شعور کا نام غناء ہے۔ پس بندے کی غناء اللہ کے تعلق کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ جہاں تک خدا کی غناء کا تعلق ہے اس کا نقشہ حضرت اقدس محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک موقع پر کھینچا اور آپ ہی کے الفاظ میں ایک لمبی حدیث میں سے ایک اقتباس پڑھ کر سناتا ہوں۔ یہ حدیث قدسی ہے یعنی خدا تعالیٰ نے حضرت اقدس محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی ذات کا عرفان ان الفاظ میں بخشا۔ فرمایا کہ یعنی دنیا کو بتا دو کہ اگر تمہارے اگلے اور پچھلے، تمہارے زندہ اور تمہارے مردہ، تمہارے رطب و یابس یعنی مومن اور غیر مومن، نیک اور بد سب کے سب میرے بندوں میں سے بد بخت ترین آدمی کے دل کی مانند ہو جائیں۔ بد بخت ترین آدمی کے دِل کی مانند یہ عجیب مثال ہے کیونکہ بد بخت ترین آدمی کا دل وہ ہے جو خدا سے سب سے زیادہ دور ہے اور خدا کا دشمن ہے تو فرمایا کہ صرف دوری نہیں مجھ سے کھوئے نہ جائیں بلکہ بد بخت ترین آدمی کے دل کی طرح سیاہ ہو جائیں اور میری دشمنی اور میری نفرت کے سوا وہاں کچھ نظر نہ آئے تو یہ بات میری بادشاہت میں ایک مچھر کے پر کے برابر بھی کمی نہیں کر سکتی۔ پس کھونے کے نتیجے میں بے چینی کا نہ ہونا یہ تبھی ممکن ہے جب اتنا ہو کہ کمی کا احساس ہی نہ ہو یہ غناء ہے ورنہ صبر ہے۔ تو حقیقی غناء خدا کے سوا کسی ذات کو حاصل نہیں ہوسکتی اور ایک جاہل کی خواب ہے اگر کوئی انسان یہ سوچے کہ میں غنی ہوں مجھے کوئی پروا نہیں۔ غناء خدا سے تعلق کے نتیجے میں پیدا ہوسکتی ہے اور خدا سے ایسے تعلق کے نتیجے میں جس کے ساتھ عجز کے باوجود مالکیت کا احساس ہو یعنی خدا کی کائنات میں خدا کی عطا کے نتیجے میں شراکت کا احساس ہو۔ یہ وہ سچا احساس اور شعور ہے جو انسان کو سچی غناء بخشتا ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر تمہارے اگلے اور تمہارے پچھلے، تمہارے زندہ اور تمہارے مردہ اور تمہارے رطب اور تمہارے یابس سب کے سب اکٹھے ہو جائیں اور ان میں سے ہر ایک مجھ سے اپنی خواہش کے مطابق مطالبہ کرے اور میں ان

میں سے ہر سوال کرنے والے کو جو کچھ اس نے مانگا ہے اسے دے دوں تو یہ چیز میری بادشاہت میں اتنی بھی کمی نہیں کر سکتی جتنا کہ وہ شخص جو سمندر کے کنارے سے گزرتے ہوئے اس میں سوئی ڈبوئے اور اسے نکال لے۔ سوئی کے ناکے کے ساتھ جتنا پانی چمٹا ہوا رہ جائے گا وہ پانی سمندروں میں جتنی کمی کر سکتا ہے تم سب کی مانگی ہوئی تمام خواہشات بھی میں پوری کر دوں تو میری کائنات میں اتنی بھی کمی نہیں آئے گی۔ یہ ہے اصل مثبت پہلو جس کے نتیجے میں وہ دوسرا پہلو پیدا ہوتا ہے یعنی غناء کا لفظ جو استغناء کے معنی رکھتا ہے وہ اس وجہ سے پیدا ہوتے ہیں استغناء کے معنے کہ غنی کے پاس سب کچھ ہے پس جس شخص کو خدا کے ساتھ ہونے کا احساس نہ ہو اور یہ یقین نہ ہو کہ خدا میرے ساتھ ہے وہ نہ غنی ہے اور نہ مستغنی ہے۔

غناء کا ایک غلط مطلب ہم اپنے روزمرہ کے تعلقات میں یہ سمجھتے ہیں کہ کسی سے تعلق ٹوٹے تو ہم کہتے ہیں جاؤ جہنم میں ہمیں کوئی پروا نہیں۔ پنجابی میں اس قسم کے بہت سے محاورے ملتے ہیں کہ جس شخص سے کسی چیز کی توقع تھی اس نے پوری نہیں کی، کسی سے تعلق تھا اس نے توڑ دیا تو اردو میں کہتے ہیں ''جاؤ جہنم میں''۔ پنجابی میں کہتے ہیں ''خصماں نوں کھا''۔ جو مرضی ہو عجیب سا محاورہ ہے اس کی تشریح کی ضرورت نہیں مگر پنجابی اس مضمون کو خوب سمجھتے ہیں۔ یہ پنجاب کی استغناء کی آخری شکل ہے۔ اس کو بدخلقی کہتے ہیں۔ یہ استغناء نہیں ہے کیونکہ خدا کو چھوڑ کر جب بدبخت جاتا ہے تو اس کے جانے سے کمی تو کچھ نہیں ہوتی مگر خدا تعالیٰ کی ذات اس کے لئے نفرت کے جذبات اپنے اندر نہیں رکھتی بلکہ اس کے واپس آنے کی منتظر ہوتی ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مضمون کو ایک اور رنگ میں یوں بیان فرمایا کہ اگر کوئی شخص صحرا میں ایسی جگہ ہو کہ دور دور تک اس کو کوئی مدد، کوئی سہارا نہ ہو۔ اس کی اونٹنی پر اس کا سارا سامان لدا ہوا ہو۔ بیچ دوپہر کے وہ آرام کی خاطر کچھ دیر کے لئے ستانے لگے اور اس عرصے اس کی اونٹنی جس میں اس کا پانی اس کی خوراک سب کچھ لدا ہوا تھا وہ بھک جائے اور اس کے ہاتھ سے جاتی رہے۔ ایسے وقت میں وہ اس اونٹنی کے لئے کیسی طلب محسوس کرتا ہے اس کا ذکر حضور نے نہیں فرمایا لیکن اس کے بعد یہ فرمایا کہ اچانک وہ اونٹنی اس کو مل جائے تو اس کو جتنی خوشی اس کھوئی ہوئی اونٹنی سے محسوس ہوتی ہے اس سے زیادہ خدا اپنے گناہگار بندے کے واپس آنے کے متعلق محسوس کرتا ہے جو اس کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ تو خدا کی غناء جو ہے یہ

اخلاق کی بہت ہی اعلیٰ منزل ہے اس کا اس بداخلاقی سے کوئی تعلق نہیں کہ ہم اپنے تعلق توڑنے والوں کو کہتے ہیں جاؤ جہنم میں کیونکہ خدا تعالیٰ ہر چیز کی پروا کرتا ہے۔ پس ایک طرف کچھ پروا نہ ہونا اور ایک طرف پروا کی حد بلکہ ایسا مقام کہ گویا حد کوئی نہیں ان دونوں کے امتزاج کا نام غناء ہے دراصل۔ وجہ یہ ہے کہ کوئی چیز جو خدا کی ملکیت ہے وہ جب اس سے الگ ہوتی ہے تو اس کی ملکیت اس سے الگ ہوتی ہے چونکہ بے انتہاء ہے اس کے پاس اس لئے اس کا الگ ہونا خدا کو نقصان نہیں پہنچاتا یہ ہے غناء لیکن جس کی جو چیز ہو اس سے اس کو پیار ہوتا ہے اور اس تعلق کی بنا پر جب وہ واپس ملتی ہے تو اس وجہ سے خوشی نہیں ہے اس کو یعنی خدا تعالیٰ کی ذات کو کہ گویا اس کے خزانوں میں اضافہ ہو گیا ہے بلکہ اس کے پیار کی طلب پوری ہوئی ہے۔ اس لئے احتیاج پورا ہونے کی مثال تو بندے کی وجہ سے دی گئی ورنہ بندہ تو ان باتوں کو سمجھ نہیں سکتا ورنہ حقیقی معنی اس مثال کے یہی ہیں کہ خدا تعالیٰ کو اپنے بندوں سے اتنا تعلق، اتنا پیار ہے کہ ان کے جانے سے اگر چہ اس کو کوئی نقصان نہیں لیکن ان کے آنے سے اس کو بہت خوشی ہوتی ہے۔ تو حقیقت میں خدا تعالیٰ کی صفات پر غور کے نتیجے ہی میں اعلیٰ اخلاق نصیب ہو سکتے ہیں اگر ہم خدا تعالیٰ کی صفات پر غور نہ کریں تو ہم ہرگز اعلیٰ اخلاق حاصل نہیں کر سکتے۔

پس فرار الی اللہ کی جب میں بات کرتا ہوں تو میری مراد یہ نہیں ہے کہ کسی بدی کو ایک دم ارادے کے ساتھ چھوڑ دیا جائے بلکہ یہ مضمون بہت گہرا ہے یعنی مومن کی زندگی میں بدی چھوڑنا اور نیکی اختیار کرنا کوئی دنیادار کے ساتھ گزرنے والا واقعہ نہیں ہے۔ بعض لوگ ارادہ کرتے ہیں کہ آج سے میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ ان کے جھوٹ چھوڑنے میں اور ایک مومن کے فرار الی اللہ میں بے شمار فرق ہے، بے انتہا فرق ہے کیونکہ مومن جب جھوٹ چھوڑ کر سچائی کو اختیار کرتا ہے تو حق کا جو تصور وہ باندھتا ہے وہ خدا کا تصور ہے اور خدا کے حق ہونے اور بندے کے سچائی کے تصور میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ خدا کی صفات میں اتنی گہرائی ہے کہ خدا کی ذات کی طرح خدا کی ہر صفت بھی لامتناہی ہے پس یہ سفر ایک ایسا سفر بن جاتا ہے جس کو انسان ساری زندگی بھی ختم نہیں کر سکتا، طے کرتا رہتا ہے یعنی ایک مقام سے دوسرے مقام، دوسرے سے تیسرے مقام، تیسرے سے چوتھے مقام کی طرف منتقل ہوتا چلا جاتا ہے لیکن یہ کہنا کہ میں نے سفر کا آخری مقام حاصل کر لیا یہ درست نہیں۔ حد استطاعت تک جیسا کہ میں نے پہلے بھی بیان کیا تھا ایک انسان اس مرتبے کو حاصل کر سکتا ہے جو خدا نے اس کی

ہیئت کے اندر رکھا ہوا ہے اس کی شاکلت کے اندر کچھ حدود مقرر کی ہوئی ہیں ان حدود کے آخری کنارے کو چھونا انسان کی تکمیل ہے اور ہر شخص کی حدود کا آخری کنارہ الگ الگ ہے۔

اسی لئے جب ہم کہتے ہیں کہ تمام نبی معصوم اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (البقرہ:۲۸۶) تو ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت اقدس محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ''سیّد المعصومین'' معصوموں کے بھی سردار تو ان دو چیزوں میں تضاد نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمام انبیاء معصوم ہیں لیکن ہر نبی اپنی استطاعت کے مطابق معصوم ہے۔ اس کے لئے خدا نے جو معصومیت کی حدیں مقرر فرمائی ہوئی تھیں ہر نبی نے اپنی اپنی حد کو چھو لیا ہے لیکن جب حدیں وسیع ہوں تو محنت زیادہ کرنی پڑتی ہے اور زیادہ جہاد کرنا پڑتا ہے ان حدوں پر عبور حاصل کرنے کے لئے۔ حضرت اقدس محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی استطاعت کی حدیں زیادہ تھیں اس لئے آپ کو بہت زیادہ محنت کرنی پڑی ہے۔ ایک لحاظ سے تو آپ نے وہی کچھ کیا ہے جو باقی انبیاء نے کیا یعنی اپنی حد استطاعت تک پہنچے لیکن ایک دوسرے لحاظ سے آپ نے اپنی حد استطاعت کو چھونے کے لئے بہت زیادہ محنت کی ہے بہ نسبت دوسرے انبیاء کے جنہوں نے اپنی اپنی حد استطاعت کو چھوا۔

چنانچہ قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرق کو ظاہر کرنے کے لئے ایک تمثیل کے طور پر ہمارے سامنے اس واقعہ کو رکھا کہ جب حضرت موسیٰ نے خدا سے یہ عرض کیا کہ مجھے اپنا چہرہ دکھا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا تو میرے چہرے کو نہیں دیکھ سکتا حالانکہ پہلا سفر جو خدا کی طرف کیا گیا تھا اس میں آپ نے خدا کو دیکھا۔ ایک آگ کے شعلے کی صورت میں آپ نے خدا کو دیکھا تھا۔ تو یہ جو فرمایا کہ تو مجھے نہیں دیکھ سکتا اس سے مراد یہ تھی کہ جو جلوہ تو چاہتا ہے وہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم والا جلوہ ہے جو آپؐ دیکھ سکتے ہیں اور تو نہیں دیکھ سکتا تو چنانچہ اس فرق کو دکھانے کی خاطر آپ نے فرمایا کہ میں پہاڑ پر تجلی کرتا ہوں اگر یہ تُو برداشت کر سکے تو پھر وہ جلوہ بھی برداشت کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب پہاڑ پر تجلی فرمائی تو پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور حضرت موسیٰؑ غش کھا کر گر پڑے۔ تو سوال یہ ہے کہ حدیں تو الگ الگ ہیں لیکن ہر حد کو چھونے کے لئے محنت میں فرق پڑ جاتا ہے۔ جس حد تک حضرت موسیٰؑ پہنچے تھے اس حد تک آنحضرت ﷺ بھی

پہنچے لیکن پھر آگے بھی تو بڑھے اس لئے کہ آپ کی حد زیادہ اونچی تھی۔ اسی مضمون کو خدا تعالیٰ نے معراج کی شکل میں بیان فرمایا۔

پس غناء کے نتیجے میں جب انسان دوسری چیزوں کو ترک کر کے خدا کی طرف منتقل ہونے لگتا ہے تو اس مضمون کو ہر انسان اپنی ذات پر پہلے چسپاں کرے اور یہ معلوم کرے کہ کہاں کہاں خدا نہیں ہے میری ذات میں اور غیر اللہ موجود ہے۔ اس طرح جب غور کرے گا تو ہر شخص کے بت بھی مختلف ہوں گے، ہر شخص کے سفر کی طوالت بھی الگ الگ ہو جائے گی لیکن ہر شخص کا انتہائی مقام ایک مقرر ہے اس مقام تک پہنچنا اس کے لئے ممکن ہے یعنی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو بننا ہر شخص کے لئے ممکن نہیں ہے یقیناً ممکن نہیں ہے یعنی اس تشریح کے ساتھ جو میں نے بیان کی ہے لیکن ہر شخص کا اپنی آخری حد کو چھو لینا یہ ممکن ہے۔

اس پہلو سے فرار الی اللہ کا سفر جو ہے وہ ساری زندگی پر محیط ہو جاتا ہے اور انسان اپنے نفس میں ڈوب کر جب وہ جگہیں تلاش کرتا ہے جہاں خدا نہیں ہے تو شاذ ہی کوئی ایک ایسا انسان ہو جسے وہ جگہیں نہ ملتی ہوں۔ اگر وہ بصارت کے ساتھ آنکھیں کھول کر دیکھے اور اگر آنکھیں بند رکھے تو ہر انسان سمجھتا ہے میرے اندر خدا ہی خدا ہے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ چنانچہ اندھے یہ دعویٰ کر دیتے ہیں کہ ہم خدا والے ہو چکے ہیں اور صاحب بصیرت لوگ جانتے ہیں کہ ہمارا ابھی بہت سا سفر طے کرنا باقی ہے۔ جن کو غیر کی نظر خدا والا سمجھ رہی ہوتی ہے ان کی اپنی نظر اپنے آپ کو خدا والا نہیں سمجھ رہی ہوتی چنانچہ وہ قرآن کریم کی اس آیت کے تابع اپنی زندگی کا سفر جاری رکھتے ہیں فَلَا تُزَكُّوٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى (النجم:۳۳) کہ تم اپنے نفسوں کا تزکیہ نہ کرو یہ فضول بات چھوڑ دو خدا ہی بہتر جانتا ہے تم میں سے کون ہے جو صحیح معنوں میں تزکیہ اختیار کر چکا ہے، مکمل تزکیہ اختیار کر چکا ہے۔ پس جماعت اگر اپنے نفس میں ڈوبنے کا شعور حاصل کر لے تو بہت سی مصیبتوں اور دھندوں سے چھٹکارا مل جائے۔ ہر وقت جو جماعت میں بعض لوگ دوسروں پر تنقید کر کے منافرت پھیلانے والے اپنی بڑائیاں کرنے والے دوسروں پر اور اپنے بھائیوں کی تحقیر کرنے والے آپ کو ملتے ہیں کسی سے چھوٹی سی غلطی ہو گئی اس کو اچھالتے ہیں اور دنیا میں اس کو مشتہر کرتے ہیں۔ سارا معاشرہ اس سے دکھی ہو جاتا ہے لیکن اگر آپ خدا کی طرف سفر اختیار کرنا شروع کریں جس طرح میں

نے آپ کو سمجھایا ہے یعنی اپنے نفس میں ڈوب کر فرار الی اللہ اختیار کرنا شروع کریں تو سارا معاشرہ ان بدیوں سے پاک ہو جائے گا۔ بجائے اس کے کہ غیر ہمارے شر سے پناہ مانگیں یہ وہ مقام ہے جہاں شرور انفسنا کی دعا حقیقت اختیار کر جاتی ہے جب انسان یہ کہتا ہے اے خدا ہمیں اپنے نفس کے شر سے بچا تو ایسا انسان جب دعا کرتا ہے ضروری نہیں حقیقی معنوں میں دعا کر رہا ہو کسی ایسے شخص کی یہ دعا قبول نہیں ہو سکتی جس کے شر سے اس کے ساتھ نہیں بچ رہے۔ جس کے شر سے اس کے بھائی، اس کی بہنیں، اس کا معاشرہ نہیں بچتا وہ اگر خدا کے حضور دِن رات یہ وظیفے کے طور پر تکرار کرتا رہے کہ اے خدا مجھے میرے نفس کے شرور سے بچا، اے خدا ہمیں ہمارے نفس کے شرور سے بچا اس کی دعا کوئی بھی معنے نہیں رکھے گی۔ جب تم غیر کو اپنے نفس کے شر سے نہیں بچاتے تو اپنے آپ کو کیسے اپنے نفس کے شر سے بچا سکتے ہو۔ اس لئے پہلے اپنے شرور کو اپنی ذات کے دائرے میں تو محدود کرو۔ غیر کو پناہ دے دو پھر یہ دعا کرو پھر اندر کا سفر جو بہت ہی مشکل سفر ہے وہ دعا کی مدد سے آسان ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ دعا کے بغیر یہ سفر اختیار کرنا اور منزلیں طے کرنا ممکن نہیں ہے۔

اس سے اگلا مقام ہے جسے تبتل کا مقام کہا جاتا ہے۔ فرار خوف سے تعلق رکھتا ہے اور تبتل طمع سے تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ فرار اور تبتل کے مضمون کو اگر سمجھنا ہو تو قرآن کریم کی یہ آیت اس کی تشریح کرتی ہے تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۱۷﴾ (السجدہ: ۱۷) کہ خدا کے بندے کچھ ایسے ہوتے ہیں جن کے پہلو راتوں کو اپنے بستروں اور آرام گاہوں سے الگ ہو جاتے ہیں يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وہ اپنے رب کو پکارتے ہیں خوف کی وجہ سے بھی اور طمع کی وجہ سے بھی۔ خوف کی وجہ سے خدا کو پکارنا اور اس کی مدد چاہنا یہ فرار الی اللہ کے مضمون سے تعلق رکھتا ہے اور طمع کی وجہ سے خدا کی طرف بڑھنا اور دوسروں سے اپنا تعلق توڑ لینا یہ تَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا (المزمل: ۹) کا مضمون ہے جو فرار کے بعد انسان کو نصیب ہوتا ہے۔

پس فرار میں غیر اللہ سے انسان اس کے ڈر سے خدا کی طرف دوڑ رہا ہے اور تبتل میں اللہ کی محبت اس پر اتنا غلبہ کرتی چلی جاتی ہے کہ غیر اللہ کی طرف سے اس کا دل بجھتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ اسے غیر اللہ سے ایک انقطاع نصیب ہو جاتا ہے۔ یہ مضمون بھی اتنا وسیع ہے کہ سوائے خدا کے چند

خوش نصیب انسانوں کے کسی شخص نے اپنی حد استطاعت تک اس مضمون کا سفر طے نہیں کیا پر حضرت اقدس محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ یکتا انسان تھے جنہوں نے تمام انبیاء سے بڑھ کر اس سفر کے سارے مراحل طے کر لئے اور کامل طور پر تبتل الی اللہ اختیار کر لیا۔ پس تبتل الی اللہ کے متعلق کچھ تفصیل ضروری ہے کیونکہ یہ خیال غلط ہے کہ پہلے فرار کی ساری منزلیں طے ہو جائیں تب تبتل کا سفر شروع ہوتا ہے۔ بیک وقت دونوں باتیں چل سکتی ہیں تبھی خدا تعالیٰ نے ایک آیت میں ان دونوں کو اکٹھا کر دیا ہے۔ یعنی تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۱۷﴾ کہ ان کے پہلو راتوں کو اپنی آرام گاہوں سے جُدا ہوتے ہیں خوف کی وجہ سے بھی اور طمع کی وجہ سے بھی۔ پس یہ درست ہے کہ جہاں انسان فرار اختیار نہیں کرتا اس حصے میں اسے خدا کی طمع نصیب نہیں ہو سکتی لیکن یہ درست نہیں ہے کہ جب تک پورا فرار نہ ہو جائے اس وقت تک کوئی طمع بھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ بعض انسان بعض گناہوں میں ملوث ہوتے ہیں اور بعض دوسرے پہلوؤں سے خدا تعالیٰ کی بعض صفات کی طمع ان کو نصیب ہو چکی ہوتی ہے۔ ان پہلوؤں میں جہاں ان کو طمع نصیب ہو جاتی ہے وہاں وہ ان کے مقابل کی برائیوں سے مکمل فرار اختیار کر چکے ہوتے ہیں لیکن بعض دوسری جگہ ان کے دامن اٹکے ہوتے ہیں۔ آپ جب جنگلوں میں سفر کرتے ہیں تو ضروری نہیں کہ آپ کا تار تار کانٹوں میں پھنس جائے۔ بعض پہلو کانٹوں میں پھنسے ہوتے ہیں، بعض آزاد ہوتے ہیں جو آگے کی طرف بڑھ رہے ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ دونوں مضمون بیک وقت شروع ہوں گے لیکن طمع کا مقام فرار کے بعد آئے گا یعنی ہر فرار کے بعد ایک طمع کا مقام پیدا ہو گا۔ اس لئے اس طمع کو تبتل میں تبدیل کر کے اگر ہم دیکھیں تو اس کا ایک نقشہ ذہن میں اُبھرتا ہے جو میں آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔

ایک پھل جو پکا ہوا نہ ہو اس کی کھال جلد اوپر سے اتارنے کی کوشش کریں گے تو آپ دیکھیں گے یا تو وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اُترے گی یا بار ہا جگہ جگہ سے وہ پھل بھی اس کے ساتھ آ جائے گا لیکن جو پھل پک چکا ہو اس کی جلد بعض دفعہ خود ہی پھول کر اس سے الگ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح بیجوں کا حال ہے اور دنیا میں ہم ہر جگہ دیکھتے ہیں کہ ایک چیز جب وہ دو تعلق رکھتی ہو تو ایک تعلق جب تک مکمل طور پر دوسرے تعلق سے مغلوب نہیں ہو جاتا وہ چیز آسانی سے اس سے الگ نہیں ہو سکتی۔

آپ میں سے ہر شخص کو تجربہ ہے زخموں کا، چوٹیں لگ جاتی ہیں اور ان کے اوپر ایک کھرنڈ سا اس کو کہتے ہیں یعنی ایک چھلکا سا آجاتا ہے زخم کے اوپر۔ نادان لوگ کچے چھلکے کو چھیڑتے رہتے ہیں۔ بچے اور بندر برداشت ہی نہیں کر سکتے وہ۔ ہلکی سی جب کھجلی پیدا ہوتی ہے وہ تبتل کے مقام سے پہلے کی کھجلی ہے۔ ابھی پورا تبتل ہوا نہیں ہوتا لیکن تبتل میں بھی ایک مزہ ہے اور اس مزے کے نتیجے میں انسانی ہاتھ جو نادانوں کے ہاتھ بار بار اس جگہ پر پہنچتے ہیں کہ اسے اب اُتار ہی دیں لیکن اتارنے کے لئے کچھ اور صبر کرنا پڑتا ہے، کسی اور وقت کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ جب مکمل طور پر وہ چھلکا اس زخم والی جگہ کو چھوڑ دیتا ہے تو ہلکا سا ہاتھ لگنے سے ہی وہ خود اُکھڑ کر ایک طرف ہو جاتا ہے۔ پس انسان کا فرار کے نتیجے میں خدا کی طرف بھاگنا اور چیز ہے لیکن خدا کی محبت کے پختہ ہونے کے نتیجے میں بعض چیزوں سے بے رغبت ہی ہوتے چلے جانا یہ تبتل الی اللہ ہے اور تبتل الی اللہ غناء کے بعد نصیب ہوا کرتا ہے۔ اسی لئے میں نے غناء کا مضمون پہلے رکھا۔ جب آپ غناء اختیار کرتے ہیں تو غناء کے متعلق میں نے بتایا تھا کہ غناء حقیقی طور پر حاصل ہو ہی نہیں سکتی جب تک خدا تعالیٰ کے قرب کا احساس نہ ہو اور جب خدا کے قرب کا احساس ہو جاتا ہے تو جس چیز سے غناء نصیب ہوتی ہے اس کے ساتھ تعلق واجبی سا رہ جاتا ہے اور یہ جو غناء کا مضمون ہے جب تبتل الی اللہ میں تبدیل ہو جاتا ہے تو پھر ایک تعلق مزید پیدا ہو جاتا ہے ان چیزوں سے جن سے انسان کا واسطہ ہے۔

یہ وہ مضمون ہے جس کو حضرت اقدس محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کے سوا کہیں اور تفصیل سے مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس ارشاد ربانی کے تابع پہلے تبتل اختیار کیا ہے۔ قانع تو آپؐ تھے ہی غناء آپؐ کو کامل طور پر نصیب تھی اور تبتل کا جو حکم آیا ہے یہ ابتدائی نبوت کے زمانے میں ہی عطا ہو چکا تھا۔ دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ترقی کی منازل اتنی جلد جلد طے کی ہیں کہ تاریخی نقطہ نگاہ سے کسی جگہ انگلی نہیں رکھی جا سکتی کہ یہاں اس منزل پر تھے اور وہاں اس منزل پہ تھے لیکن مضمون کی اندرونی ترتیب کے لحاظ سے انگلی رکھی جا سکتی ہے کہ یہ ہوا پھر یہ ہوا پھر یہ ہوا۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خدا کی ذات سے عشق کے کمال کا نتیجہ تھا کہ آپؐ کو تمام بنی نوع انسان، تمام مخلوقات سے تبتل نصیب ہوا اور تبتل کا مطلب یہ ہے کہ ظاہری تعلق موجود رہا لیکن دل خدا کی طرف مائل ہو چکا تھا۔ جتنا زیادہ تبتل ہوا اتنا

علیحدگی کی تکلیف کم ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ عام انسان اپنے روزمرہ کے تجربے میں بعض جدائیوں کو برداشت نہیں کر سکتے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کا تبتل الی اللہ نہیں ہوتا۔ بعض مائیں اپنے بچوں کی موت کے صدمے سے مر جاتی ہیں اور واقعۃً ایسا ہوتا ہے۔ ابھی آج ہی کی ڈاک میں میں نے ایک خط دیکھا جس میں بتایا گیا کہ ایک احمدی ماں کا بچہ جوان فوت ہو گیا حادثے میں اس کے چند دن کے بعد وہ صدمے سے چل بسی حالانکہ اور کوئی بیماری نہیں تھی۔ تبتل حقیقت میں اس چیز کا نام ہے کہ باقی چیزوں سے تعلق موجود ہوتے ہوئے بھی وہ تعلق اتنا واجبی سا رہ جائے کہ ان معنوں میں واجبی کہ اگر وہ الگ ہو جائے تو کوئی نقصان محسوس نہ ہو اور نقصان نہ ہو۔ نقصان محسوس نہ ہو اور بات ہے کسی قسم کا نقصان نہ ہو یہ وہ مضمون ہے جو زیادہ باریک ہے جس کو سمجھانے کے لئے تھوڑا سا وقت میں اور لگاؤں گا۔

ہر شخص کو اپنے پیارے کی جدائی کا نقصان محسوس ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب اپنے بچے ابراہیمؓ کو قبر کی لحد میں اُتار رہے تھے تو آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور اپنے پیاروں کی جدائی کا غم محسوس کیا کرتے تھے۔ شہداء کی جدائی جن کے متعلق خدا نے خبر دی تھی واضح طور کہ وہ زندہ ہیں اور جنت میں ہیں ان کی جدائی کا بھی آپ غم محسوس کیا کرتے تھے۔ پس تبتل الی اللہ سے مراد یہ نہیں ہے جیسا کہ میں نے غناء کے مضمون میں سمجھایا کہ نقصان کا احساس نہ ہو لیکن اپنے وجود کو اپنے روحانی وجود کو، وہ جدائی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ چنانچہ یہ جو سلسلہ ہے نقصان کے نہ ہونے کا اس کو پھوڑے والی مثال میں اُلٹا کے آپ دیکھیں تو پھر زیادہ سمجھ آ جائے گی۔ جب زخم کی جلد الگ ہوتی ہے صحت مند جلد سے تو ایک کمی تو آتی ہے اور کچھ دیر کے لئے اس جگہ جہاں سے وہ زخم کا چھلکا الگ ہوا ہے احساس رہتا ہے کچے پن کا۔ ایک کمی کا احساس موجود ہوتا ہے لیکن حقیقت میں نقصان نہیں ہوتا۔ پس اس لئے اس کو سمجھانے کی خاطر میں نے نقصان کے احساس اور نقصان میں فرق کرنے کی کوشش کی ہے، فرق دکھانے کی کوشش کی ہے کہ جلد جس کے اوپر سے زخم کا چھلکا اُتر رہا ہے وہ اس کی جدائی کو محسوس ضرور کرتی ہے لیکن فی الواقعہ اس کا نقصان کوئی نہیں ہے۔ پس تبتل جب کامل ہو تو حضرت اقدس محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح وہ تبتل انسان کے روحانی وجود کو کسی جدائی پر کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا کیونکہ الی اللہ ہے۔ ایک طرف سے ایک چیز چھٹی تو دوسری طرف سے

کامل طور پر حاصل ہوگئی ہے اور انحصار کلیۃً خدا کی ذات پر ہو چکا ہے لیکن دنیا کے محسوسات کے مطابق انسانی محسوسات کے مطابق انسان جدائیوں کو کچھ نہ کچھ محسوس ضرور کرتا ہے لیکن ان دونوں چیزوں میں بڑا فرق ہے۔ ایک عام انسان کا اپنے نقصان کو محسوس کرنا اور ایک ایسے انسان کا محسوس کرنا جس کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ تبتل کے نتیجے میں تعلق قائم ہو چکا ہے۔ ایسے لوگوں کی روحیں آسانی سے نکلتی ہیں۔

اس مضمون کے متعلق بھی ایک غلط فہمی ہے جو میں آپ پر کھولنا چاہتا ہوں۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خاموشی سے بغیر تکلیف کے جو مر جائے وہ گویا کہ تبتل کی نشانی ہے۔ یہ درست نہیں ہے۔ تبتل روحانی معنوں میں ہوا کرتا ہے اور بعض دفعہ خدا کے نیک بندے بھی ایسی جسمانی اذیت میں مبتلا ہوتے ہیں کہ اس سے وہ بے چینی محسوس کرتے ہیں۔ اُن کو دنیا چھوڑنے کی بے چینی نہیں ہوا کرتی۔ دنیا چھوڑنے کے وقت جو تکلیف ہو رہی ہوتی ہے مادی جسمانی اس کی بے چینی ہوتی ہے۔ پس حضرت اقدس محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی آخری لمحات میں جو بیماری کی بے قراری تھی وہ بشری تقاضا تھا۔ بیماری کی وجہ سے آپؐ کا جسم تکلیف محسوس کرتا تھا اور جتنا خدا سے تعلق بڑھتا ہے انسان زود حس ہوتا چلا جاتا ہے۔ تکلیف پر واویلا بے شک نہ کرے لیکن ہر نفیس طبیعت والے انسان کو تکلیف زیادہ محسوس ہوا کرتی ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ جو شخص آرام سے جان دے دے وہ بڑا ولی اللہ ہے اور جس کی جان مشکل سے نکلے وہ نعوذ باللہ من ذالک خدا سے دور ہے یہ بالکل غلط بات ہے۔ یہ وہ بات ہے جو حقیقت میں خدا کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔ ایک انسان جب اپنے پیاروں سے جدا ہو رہا ہوتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ میں خدا کی طرف جا رہا ہوں۔ اس وقت اس کی روح کے اندر ایک موازنہ ہو رہا ہوتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب یہ اختیار دیا گیا تو آپؐ نے بار بار عرض کیا فی الرفیق الاعلیٰ ۔فی الرفیق الاعلیٰ ۔فی الرفیق الاعلیٰ ' (بخاری کتاب المغازی حدیث نمبر: ۴۴۳۸) اے میرے خدا میرا چین تو تیری ذات ہے۔ میرا آسمانی رفیق یہ نہیں فرمایا کہ صرف تو ہی رفیق ہے اور بھی رفقاء تھے، دنیاوی رفیق بھی تھے ان کے اور خدا کی رفاقت کے درمیان جب یہ فیصلہ تھا کہ اب ان کو کلیۃً چھوڑنے کے بعد ایک رفاقت عطا ہونی ہے تمہیں۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دل کی صدا تھی فی الرفیق الاعلیٰ ، فی الرفیق الاعلیٰ جب بھی مقابلہ ہوگا، جب بھی

موازنہ ہوگا تو ادنیٰ رفیق کو چھوڑ دیا جائے گا اور اعلیٰ رفیق کی طرف روح حرکت کرے گی۔ چونکہ ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف حرکت ہے اس لئے اس موازنے کے وقت اس جدائی کی وہ تکلیف نہیں ہوتی مگر جن کا کلیۃً انحصار دنیا پر ہوتا ہے جن کی لذتیں ہی دنیا کی ہوتی ہیں، جن کے تعلقات کے مزے دنیا کے تعلقات کے مزے ہوتے ہیں اور ان کو خدا کے تعلق کا مزہ اس دنیا میں نصیب نہیں ہوتا ان کی موت خواہ جسمانی لحاظ سے آرام سے بھی آئے بڑی مشکل موت ہوا کرتی ہے کیونکہ وہ حسرت کے ساتھ ہر چیز کو دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ یہ بھی میرے ہاتھ سے گیا، یہ بھی میرے ہاتھ سے گیا، اچھا مکان بنایا تھا اس کو تو رہنا نصیب نہیں ہوا، اچھے کپڑے بنائے تھے پہننے نصیب نہیں ہوئے، اولاد خدا نے دی تھی ان کی شادیاں، ان کی خوشیاں دیکھنی نصیب نہیں ہوئیں۔ ہزار قسم کی بے نصیبیاں اس وقت اس کے سامنے ہیولے بن کر اُٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔ ہر طرف اس کو نامرادی اور ایک نقصان اور زیاں کا احساس محسوس ہوتا ہے جس طرح غول بیابانی کسی چیز کو گھیر لیں اس طرح اس کے چاروں طرف یہ دنیا کے بھوت اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ وہ تکلیف دہ موت ہے جو جسمانی طور پر تکلیف دہ نہ بھی ہو روح کے لئے بڑی اذیت ناک ہوا کرتی ہے۔

پس تبتل الی اللہ اس وقت اختیار کرنا چاہئے جب ابھی جدائیوں کے وقت نہ آئیں۔ جدائیوں سے پہلے تبتل اختیار کر لیا جائے تو انسان ہر نامرادی سے بچ جاتا ہے اور اس کی ہر مراد پوری ہو جاتی ہے مگر تبتل الی اللہ میں کچھ نہ کچھ ابتدا میں انسان کو از خود محرومی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ بغیر محرومیاں اختیار کئے انسان کو مکمل طور پر تبتل نصیب ہو جائے۔ چنانچہ بے شمار انسانی تعلقات میں سے ہر تعلق پر نظر رکھنی ہوگی کہ اس تعلق کی جڑیں میری ذات میں پیوستہ ہیں یا یہ تعلق ایک سطحی تعلق ہے جس کے الگ ہونے کے نتیجے میں مجھے میری ذات کو نقصان نہیں ہوگا۔ جب جڑیں پیوستہ ہوں کسی چیز میں اس پودے کو اس درخت کو اُکھاڑ کر آپ دیکھیں جس ذات میں پیوستہ ہوتی ہیں جڑیں اس کی بہت ساری مٹی اس جگہ کی مٹی اور اس کے ساتھ لگا ہوا مواد سب ساتھ اچھل کر کے آجاتے ہیں لیکن جو چیز تبتل اختیار کر چکی ہو وہ بڑے آرام سے نئی سمت میں انتقال اختیار کر لیتی ہے اور کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ روزمرہ کی زندگی میں ایسے انسان کو صبح شام تجربے ہوتے ہیں ان تجربوں کی روشنی میں انسان کو اپنی روحانی زندگی کا مسلسل جائزہ لینا چاہئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے جو تبتل اختیار فرمایا اس کا مطلب یہ تھا کہ تمام دنیا کے تعلقات کو رکھتے ہوئے بھی آپ ان سے الگ ہو گئے اور یہ تبتل ایک انتہائی تنہائی کا مقام ہے۔ایک شاعر نے کہا ہے

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

لیکن تبتل کا مضمون اس مضمون کی انتہائی شکل ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدا کے لئے اپنے تعلقات کو اس طرح الگ کرنا شروع کیا کہ سب کچھ پاس ہوتے ہوئے بھی آپ تنہا رہ گئے۔یعنی اگر خدا کی ذات نہ ہو تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک انسان تھے جو تمام کائنات میں تنہا تھے کوئی اور تعلق آپ کے کام کا نہیں تھا سوائے خدا کے تعلق کے۔یہ وہ تبتل کا مقام ہے جس کے بعد خدا سارا انسان کا ہو جاتا ہے۔اور وہ تبتل جس جس حصے میں نصیب ہوتا چلا جاتا ہے اتنا اتنا خدا اس کو ملتا چلا جاتا ہے۔پس ہمیں اپنے تعلقات سے جدائیاں اختیار کرنی پڑیں گی تب اس کے مقابل پر خدا کا وصل نصیب ہوگا اور یہ جدائیاں اس وقت اختیار ہونی چاہئیں جب ہمارے اختیار میں ہے شاعر نے تو کہا ہے کہ

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

دوسرا نہ ہونا پاس یہ تو اتفاق کی بات ہے۔دنیا میں ہر روز وہ چلتا پھرتا تھا اس کو کبھی جلوت نصیب ہوتی تھی کبھی خلوت بھی ملتی تھی لیکن دنیا میں اکثر حصہ انسان کا جلوتوں میں ہی گزرتا ہے قسمت سے اس بے چارے کو معلوم ہوتا ہے کبھی خلوت ملتی تھی وہ اپنے محبوب کو یاد کیا کرتا تھا گویا وہ اس کے پاس آ گیا۔لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ساری جلوتیں نصیب ہوتے ہوئے بھی ایک خلوت نصیب ہوئی۔بیوی سے تعلقات کے وقت بھی وہ خلوت نصیب تھی۔چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ جو نصیحت فرمائی ہے یہ صاحبِ عرفان جو اس تجربے میں سے گزرا ہوا نہ ہو اس کے بغیر کسی کے ذہن میں پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔آپؐ نے فرمایا جو شخص اپنی بیوی کے منہ میں لقمہ اس خیال سے ڈالتا ہے کہ میرا اللہ راضی ہوگا اس کا حکم ہے کہ اپنی بیوی سے نرمی کا سلوک کرو۔اس کا ایک لقمہ ڈالنا بھی عبادت بن جاتا ہے۔یہ ہے خلوت کے اندر جلوت یا جلوت کے اندر خلوت یعنی بظاہر ایک

انسان سے تعلق ہے لیکن اس کی گہرائی کے اندر دراصل خدا کا تعلق کام کر رہا ہے۔ پس تمام کائنات میں جب آپ تنہا رہ گئے ہیں اور ہر دوسری چیز سے آپ نے تعلق کامل طور پر توڑ لیا ہے اس وقت کامل طور پر خدا آپ کا ہوا ہے اور یہ تعلق توڑنا اور تعلق جوڑنا ایسا مضمون نہیں ہے جو کسی وقت کے لحاظ سے ایک لمحے میں پیدا ہوا ہو۔ جیسا کہ میں نے بیان کیا تھا یہ مسلسل ایک سفر کی حالت کا نام ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ساری زندگی بعض تعلقات توڑنے اور بعض تعلقات قائم کرنے کے میں گزری ہے۔ اس کے بعد جب آپ کو یہ خلوت نصیب ہو جاتی ہے تو خدا کی عجیب شان ہے کہ وہ ان تعلقات کو دوبارہ عطا کرتا ہے اور آپ کو دنیا کے لحاظ سے بھی تنہا نہیں رہنے دیتا۔ چنانچہ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝ (النجم: ۹-۱۰) میں یہی مضمون بیان ہوا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے روحانی سفر میں ایسا دنو اختیار فرما گئے اتنا قریب ہو گئے خدا کے کہ تمام دوسرے غیر اللہ، تمام مخلوق سے آپ کا تعلق ٹوٹ گیا۔ فَتَدَلّٰى پھر اس کے بعد خدا کی محبت کے نتیجے میں خدا کی مخلوق کی طرف ایک نیا رجحان پیدا ہوا، ایک نیا تعلق پیدا ہوا اور وہ تعلق خدا کے واسطے سے تھا اس لئے وہ عبادت تھا۔

پس خدا تعالیٰ آپ کو تنہا رکھنے میں خوش نہیں ہے، خدا تعالیٰ آپ کی جھوٹی جلوتوں کو توڑتا ہے اور فنا کر دینا چاہتا ہے۔ خدا کی خاطر آپ کو ویرانے اختیار کرنے پڑتے ہیں اور پھر خدا ان ویرانوں کو دوبارہ بساتا ہے، نئی جنتیں آپ کو عطا کرتا ہے، نئی بہاریں اور نئے جلوے آپ کو بخشتا ہے۔ وہ کائنات ہے جو زندہ رہنے کے لائق ہے جو اس لائق ہے کہ آپ اسے یہ سب کچھ چھوڑ کر بھی اختیار کریں اور اس نئی کائنات کے حصول کی کوشش کرنا حقیقی اسلام ہے اور یہی وہ فرار الی اللہ ہے آخری منزل جس کی یہ ہے۔

پس جماعت احمدیہ جب تک اس سفر کو اس طرح قدم بقدم اختیار کرنا نہیں سیکھے گی جس طرح میں نے سمجھایا ہے ایک فرضی چھلانگ میں آپ سارے مراحل طے نہیں کر سکتے۔ اتنا بڑا کام ہے، اتنا وسیع ہے، اتنا باریک بینی کا کام ہے کہ فرار کی پہلی منزلیں ہی آپ اختیار کرنے کی کوشش شروع کریں تو آپ کو پتا چل جائے گا کہ کتنا مشکل کام ہے۔ گناہوں کا عرفان بڑھانا، خطروں کو پہچاننا، ان سے خوف محسوس کرنا، ان سے نفرت پیدا کرنا دلوں میں اور خدا کی طرف دوڑنے کی کوشش

کرنا کوئی شخص اگر ساری زندگی میں اسی جھگڑے کو نپٹا جائے گا تو میں کہہ پاؤں گا کہ خدا کی قسم وہ بھی کامیاب ہو گیا لیکن ان جھگڑوں کو نپٹا کر پھر غناء کے مضمون میں داخل ہونا اور پھر غناء کے نتیجے میں تبتل کے مقام کو سمجھنا اور پھر تبتل کی کوشش کرنا یہ تو بہت ہی وسیع مضمون ہے اور جب تک خدا تعالیٰ کا فضل شامل نہ ہو انسان کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ دعا کی مدد کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ پس قرآن کریم میں جو فرمایا تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۱۷﴾ اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ الگ ہوتے ہیں لیکن جانتے ہیں کہ ہم اپنے بستروں اور آرام گاہوں سے الگ ہوتے ہیں لیکن جانتے ہیں کہ ہم اپنی کوشش سے اپنے خدا کو نہ خوف کے ذریعے حاصل کر سکتے ہیں نہ طمع کے ذریعے حاصل کر سکتے ہیں۔ ہاں دعا کے ذریعے ہم ضرور ان تمام مراحل کو طے کر سکیں گے۔

پس یہ سارا سفر دعا کے ذریعے طے ہوتا ہے۔ مسلسل دعا، ہر قدم پر دعا، ہر اگلی منزل کے لئے دعا، ہر پچھلی منزل سے دور ہونے کے لئے دعا، اس سے کامل قطع تعلقی کے لئے دعا، یہ دعا کہ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿۹﴾ (آل عمران:۹) جتنی بھی قرآن کریم میں دعائیں آپ پائیں گے ان میں یہی مضمون بیان ہوگا کہ فرار کے لئے، غناء کے لئے، تبتل کے لئے، خدا کو کامل طور پر پالینے کے لئے پھر خدا کی خاطر بنی نوع انسان پر جھکنے کے لئے اور ان کے فائدے کے لئے ہر قربانی کے لئے تیار رہنے بلکہ ہر قربانی پیش کرنے کے لئے ہر ہر قدم پر آپ کو دعا کی ضرورت ہوگی۔

خدا کرے کہ جماعت احمدیہ کا ہر فرد اس سفر کو قرآنی تعلیم کے مطابق اختیار کرے اور ہم اپنے لئے بھی دعا کریں اور اپنے بھائیوں کے لئے بھی دعا کریں۔ اپنے سے طاقتوروں کے لئے بھی دعا کریں اور اپنے کمزوروں کے لئے بھی دعا کریں کہ خدا جماعتی لحاظ سے ہمیں یہ عظیم الشان سفر اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس سفر کے تمام مراحل کو ہمارے لئے آسان فرما دے ورنہ اس کی مدد کے بغیر ہم ایک قدم بھی اس کی راہ میں آگے نہیں بڑھا سکتے۔